رضا علی عابدی

# کمپیوٹر آمد، کتابت برخاست

مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب کراچی سے تیزگام کی ایک بوگی میں بھر کر اخباری کارکنوں کا قافلہ روزنامہ جنگ نکالنے کے لیے راولپنڈی کی طرف روانہ ہوا تھا۔ ۱۹۵۹ء اپنے خاتمے کے قریب تھا اور راولپنڈی میں سردی زوروں پر تھی لہٰذا یہ کارواں گرم کپڑوں سے لدا پھندا تھا اور ہر طرح کے بستر بندوں، ٹرنکوں، پیٹیوں، سوٹ کیسوں، رسی میں بندھی ہوئی دریوں اور تکیوں اور کھانے سے بھرے ہوئے ناشتے دانوں سے پوری طرح آراستہ تھا۔

ریل کے اس ڈبے میں ادارتی عملے کا صرف ایک شخص تھا اور وہ بھی نو آموز سا جونیئر سب ایڈیٹر رضا علی۔ دو تین دوسرے محنت کش تھے باقی سارے کے سارے کاتب تھے۔ چالیس نہیں تو پانچ کم چالیس ضرور ہوں گے۔ راولپنڈی سے اردو روزنامہ نکالنے کے لیے یوں تو خود راولپنڈی میں مقامی کاتب بھرتی کیے جا سکتے تھے لیکن اتنے سارے کاتب کراچی سے لے جانے کا ایک مقصد بھی تھا، اور وہ یہ کہ پنجاب کے کاتبوں کا خط لاہوری تھا اور روزنامہ جنگ اپنے دلّی کے خط کی وجہ سے مشہور بھی تھا اور یہی اس کی پہچان بھی تھی۔ اب تک یہ اخبار ہوائی جہاز کے ذریعے جایا کرتا تھا لیکن اب جب کہ ملک کا دارالحکومت راولپنڈی کے نواح میں بننا قرار پا رہا تھا، وہاں سے روزنامے کی اشاعت شروع کر دینا ہی کافی نہ تھا بلکہ ضروری تھا کہ اس کی شکل و شباہت بھی ویسی ہی ہو جیسی کراچی ایڈیشن کی تھی۔ وہی بات کہ اخبار کا دہلوی خط برقرار رکھنا ضروری تھا۔

چنانچہ دلّی کی بولی بولتا ہوا یہ قافلہ اُس رات پوٹھوہاری سرزمین پر اس شان سے وارد ہوا کہ کڑاکے کا جاڑا تھا اور آسمان سے دھند اتر رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے کہ صبح جس وقت بچے اسکول

کی بسوں میں چڑھا کرتے تھے، پنڈی کا درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے اتر جایا کرتا تھا۔ کراچی کے باشندے برسوں میں ایک آدھ بار چنے برابر اولے گرنے کے منظر سے تو واقف تھے مگر یہ غضب کا جاڑا اگر ان کی انگلیوں کو یخ کر دیتا تو کتابت کا کوئی متبادل ذریعہ فراہم کرنے کے لیے کاتبِ تقدیر سے گڑگڑا کر استدعا کرنا پڑتی۔ (دلّی کی بولی میں: کرنی پڑتی)

راولپنڈی کے علاقے صدر میں اُس وقت کی ایڈورڈز روڈ پر کیفے کامران کی اوپر کی منزل میں جنگ کا دفتر قائم کیا گیا جس میں ادارتی عملے کے لیے ایک معقول کمرے کا لیکن کئی درجن کاتبوں کے لیے ایک کشادہ برآمدے کا انتظام کیا گیا جسے گرم رکھنے کا وافر بندوبست بھی تھا اور کاتبوں کی آنکھوں کی خیر، اس خیال سے تیز روشنی کا اہتمام بھی تھا۔ یہ کاتب دیوار سے ٹیک لگا کر اور گھٹنے پر کاغذ رکھ کر کتابت کرتے تھے اور بلاشبہ صاحبِ کمال تھے۔

ان کا پہلا کمال یہ تھا کہ ادارتی عملے کی بدخطی کے خوب شناسا تھے۔ تھوڑا سا عملہ ہوتا تھا جسے اخبار کے آٹھ دس صفحے بھرنے ہوتے تھے اس لیے لوگ بہت تیزی سے لکھتے تھے اور انہیں یہ اطمینان تھا کہ کاتبوں کی یہ فوج ظفر موج یہ مطالبہ نہیں کرے گی کہ عیسیٰ کے لکھے کو پڑھنے کے لیے اب کہیں سے موسیٰ کو لایا جائے۔

کاتبوں کا دوسرا کمال یہ تھا کہ دن دیکھتے تھے نہ رات، موقع کا خیال ہوتا تھا نہ محل کا، بس بیمار ہو جاتے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا کہ کم سے کم تین چار کاتب غیر حاضر رہا کرتے تھے۔

یہ ایک مخصوص ہنر سے جڑا ہوا ایک پیشہ تھا، کوئی مزدوری نہ تھی کہ دس مزدور علیل ہو گئے تو کسی کو دوڑا کر بازار سے دس اور مزدور بلا لیے۔ مالکانِ اخبار پر لازم تھا کہ اپنے عملے ہی سے کام چلائیں۔ پھر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ دہلوی خط والے کاتبوں کے بیچ میں لاہوری خط والے عارضی کاتبوں کو بٹھا کر کام نکال لیا جائے۔ اس کا علاج یہ تھا کہ جہاں تیس کاتبوں سے گزارا ہو جائے وہاں چالیس بھرتی کیے جائیں۔ یوں نہ ہو تو اس تیز گام کا چلنا مشکل ہو جائے۔ چنانچہ کاتبوں کے عملے نے، جو فوج کم اور ظفر موج زیادہ تھی، راتوں کو جاگ جاگ کر اخبار کی کتابت شروع کی۔ وہ مفلسی کے دن تھے اور اخبار کے مالکوں اور عملے کے افراد کے لیے ممکن نہ تھا کہ اپنی سواریوں کا



بندوبست کر کے رات دو ڈھائی بجے گھروں کو جائیں۔ آخری کاپی پریس بھیج کر یہ لمبا چوڑا قافلہ دفتر سے باہر نکلتا اور گھروں کی طرف پیدل چل پڑتا۔

صدر کے کتوں اور پولیس والوں نے یہ منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دونوں ہی قافلے کی راہ روکتے اور اپنے اپنے انداز میں پوچھ گچھ کرتے۔ پولیس والے تو کچھ عرصے میں عادی ہو گئے لیکن کتے برسہا برس بھونکتے رہے اور ان کے بارے میں یقین ہے کہ ان کی اولادیں آج بھی راتوں کو با آواز بلند نہیں تو دل ہی دل میں ضرور بھونکتی ہوں گی۔

مگر میرا موضوع نئے دارالحکومت کی تعمیر سے پہلے ہی نئے اخبار کی اشاعت نہیں۔ میرا موضوع یہ ہے کہ اردو اخبار، رسالے، کتاب اور جریدے کی اشاعت میں کاتب کا کیا عمل تھا اور اس سے بھی بڑھ کر کیا دخل تھا۔ یقین ہے کہ یہاں پہنچتے پہنچتے قارئین کو صورت حال کا تھوڑا، اور ممکن ہے بہت اندازہ ہو گیا ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ خطاطی کو اردو رسم الخط اور نستعلیق کے تاج میں کسی بھی پرندے کا پر کہا جائے، یہ کتابت اردو کی ترقی کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی تھی۔ کاتب کے بغیر اردو کا ہر کام بند تھا۔ اردو کی پیش رفت کاتب کی مرہون منت تھی۔ سارا روزگار اس ایک پیشے سے یوں بندھا ہوا تھا جیسے اسکول میں دو دو بچوں کی ایک ایک ٹانگ ایک دوسرے سے باندھ کر تین ٹانگوں کی دوڑ کرائی جاتی تھی۔

شروع شروع میں لوگ کہتے تھے، بعد میں کہنا بھی چھوڑ دیا کہ اردو کو کاتب سے جس قدر جلد نجات ملے، اچھا ہو۔ کیوں نہ یہاں شروع شروع کی کہانی بیان کر دی جائے۔

ہندوستان میں جب تک چھاپہ خانہ نہیں آیا، تمام کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ جن لوگوں کا پیشہ خوش نویسی تھا وہ گھروں میں بیٹھ کر اُس دور کی کتابوں کی نقل کیا کرتے تھے اور بازار میں لے جا کر فروخت کیا کرتے تھے۔ برٹش لائبریری میں 'حالِ جنگِ کابل' کا جو مخطوطہ رکھا ہے، ایسا ہی کوئی خوش نویس لکھ کر بازار میں لایا ہوگا۔ جب کسی انگریز نے اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو کاتب نے کسی طرح سے کتاب پر لکھی ہوئی پہلی قیمت مٹا کر اسے 'آٹھ آنہ' بنایا۔ سچ تو

یہ ہے کہ چھاپہ خانہ آ جانے کے بعد بھی عرصے تک کتابیں ہاتھ سے نقل کر کے فروخت کرنے کا سلسلہ چلا۔

اس کا دلچسپ منظر میں نے ۱۹۸۲ء میں پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں دیکھا جس کے نگراں اس وقت عابد رضا بیدار تھے اور انہوں نے دنیا کو دکھا دیا تھا کہ زندہ اور جیتا جاگتا کتب خانہ کیسا ہوتا ہے۔

اس لائبریری میں جو لوگ ہاتھ کے لکھے ہوئے پرانے نسخوں کی نقل حاصل کرنا چاہتے تھے ان کے لیے جدید مشینوں پر فوٹو کاپی یا زیروکس کاپی نہیں بنائی جاتی تھی بلکہ لائبریری میں خوش نویس بیٹھا کرتے تھے جو پرانے نسخوں کی نقل کیا کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ نقل کے لیے کہیں سے کاغذ بھی اسی پرانی وضع کا حاصل کیا جاتا تھا یہاں تک کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگا تھا۔

اسی شہر پٹنہ میں مجھ سے تقریباً ایک سو برس پہلے چارلس ولکنس (وفات ۱۸۳۶ء) بھی آئے تھے جنہیں اردو چھاپے خانے کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ انگلستان سے ہندوستان پہنچ کر اور کلکتے میں رہ کر انہوں نے مقامی بولیوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ پٹنہ میں انہیں سکھوں کے کالج میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں انہوں نے غالباً پہلی بار لوگوں کو پنجابی بولتے سنا اور لکھا کہ ان کی بولی میں فارسی، عربی اور کچھ سنسکرت کی آمیزش ہے اور ان کا لہجہ 'ہندوی' سے ملتا جلتا ہے۔

اُس وقت اردو کا یہی نام تھا۔ خود انگریز ہماری زبان کو ہندوستانی کہنے لگے تھے اور اب تک کہتے ہیں۔ چارلس ولکنس ایسٹ انڈیا کمپنی کے پہلے لائبریرین کی حیثیت سے ولایت سے بنگالہ گئے تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ کتنے پڑھے لکھے تھے لیکن زبانیں سیکھنے کا غیر معمولی ہنر آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے انہوں نے بنگالی، فارسی اور عربی سیکھ لی اور سنسکرت سے تو ایسا عشق اختیار کیا کہ 'بابائے سنسکرت' کہلائے جانے لگے۔ ولکنس کو دوسرا فن ٹائپ کے حروف ڈھالنے کا آتا تھا۔ اُس زمانے میں چھاپے کا دوسرا نام ٹائپ ہی تھا۔ اس وقت طباعت کا کوئی دوسرا تصور ہی نہ تھا۔ کتابت کر کے کتاب چھاپنے کا کسی کو خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ چنانچہ ولکنس نے ایک ہندوستانی



لوہار 'پنچانن' کو ساتھ ملایا اور بنگالی کا ٹائپ ڈھال کر ہگلی کے ایک کتب فروش کے چھاپے خانے میں بنگالی کی پہلی قواعد بھی چھاپ دی۔ یہ بات ۱۷۷۸ء کی ہے۔ یہ کامیابی دیکھ کر لارڈ ہیسٹنگز کی حکومت نے سرکاری چھاپہ خانہ قائم کرنے کی منظوری دے دی۔ انگریزی اور بنگالی ٹائپ تو بن چکا تھا۔ اب فارسی کی باری تھی۔

اُس وقت ہندوستان میں ساری سرکاری کارروائی فارسی میں ہوتی تھی۔ لوگ بولتے اردو تھے، شعر اردو میں موزوں کرتے تھے لیکن لکھتے فارسی تھے۔ نجی خطوط اور پوسٹ کارڈ تک فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ درخواستیں، عرضیاں، عذرداریاں، سب کی سب فارسی میں ہوا کرتی تھیں۔ اب جو ولکنس نے فارسی ٹائپ تیار کیا تو ساری سرکاری دستاویزیں اور قواعد وضوابط فارسی میں طبع ہونے لگے۔ پھر کلکتے میں پہلی ادبی کتاب چھپی جو نستعلیق ٹائپ میں کمپوز کی گئی۔ یہ فرانسس بالفور کی The Form of Haerkeru تھی۔ اس میں ہر قسم کی کاروباری دستاویزات اور خط و کتابت کے نمونے جمع کر دیے گئے تھے۔ اسی کو ایک لحاظ سے برصغیر میں اردو طباعت کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔

خود ولکنس نستعلیق حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کے کام سے مطمئن نہیں تھے اور اس ٹائپ کی شکل وشباہت سے بھی ناخوش تھے لیکن بعد میں جان گلکرسٹ نے اسے 'نفیس' قرار دیا اور اسی کو عزیز بنا کر رکھا کہ جب ۱۸۰۳ء کے لگ بھگ اردو کی کتابیں چھپنی شروع ہوئیں تو ساری کی ساری اسی ٹائپ میں چھپیں۔ میر امن کی باغ و بہار سے لے کر میر تقی میر کی کلیات جیسی ضخیم کتاب تک ان ہی نستعلیق حروف میں شائع ہوئیں۔

ان زبانوں کی کمپوزنگ کے لیے کلکتہ کے سرکاری چھاپے خانے میں ایک پنڈت، ایک منشی اور ان کے سولہ مددگار رکھے گئے۔ اس دور کی ساری کی ساری کتابیں بے حد احتیاط سے محفوظ ہیں جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ وہ ٹائپ کیسے بنایا گیا ہوگا، اس کی کمپوزنگ کیونکر ہوتی ہوگی، ان کے فرموں کو کیسے سنبھالتے اور سمیٹے رکھتے ہوں گے کہ جس میں حروف برابر برابر نہیں بیٹھتے بلکہ ایک دوسرے کے اوپر چڑھتے بھی ہیں۔

ولکنس صاحب کی یہ ایجاد اردو طباعت پر کتنا ہی بڑا احسان سہی، اس نستعلیق ٹائپ کی قسمت میں طویل عمر نہیں لکھی تھی۔

آخر وہ دن آ پہنچا جس نے کاتب نامی مخلوق کو جنم دیا۔ ہوا یہ کہ نقشے اور اشکال چھاپنے کے لیے وہ چھاپہ خانہ رواج پا گیا جسے لیتھو کہا جاتا تھا۔ اس میں ٹائپ کو دخل نہیں تھا بلکہ پتھر کی سلوں پر نقشوں وغیرہ کا چربہ اتار کر اور اس پر بیلن سے سیاہی پھیر کر سیکڑوں نقلیں اتار لی جاتی تھیں۔ اس وقت ہندوستانیوں کی ایجاد کی رگ پھڑکی اور کسی کو خیال آیا کہ کیوں نہ نقشوں کی جگہ خوش نویسی کے چربے اتارے جائیں۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اردو، فارسی اور عربی کتابوں کی کتابت چھاپہ خانے کے راستے کتابوں میں ڈھلنے لگی اور ہماری ساری طباعت ٹائپ کے آہنی جنگلے سے رہائی پا کر لیتھو کے سنگلاخ میدانوں میں قلانچیں بھرنے لگی۔

دیکھا دیکھی وقت نے بھی قلانچیں بھریں۔ پتھر کی سلیں رخصت ہوئیں۔ ان کی جگہ جست کی پلیٹیں آ گئیں۔ چھاپہ خانے نے زیادہ تیزی پکڑی تو یہی پلیٹیں روٹری مشینوں پر چڑھ کر لاکھوں کی تعداد میں اخبار اور کتابیں چھاپنے لگیں۔

سب کچھ ہوا، کتابت نے اردو کا دامن نہ چھوڑا۔

جب تک لیتھو کی چھپائی چلی، اس کے پہلو سے لگی لگی وہ تحریک بھی چلی جس کا مقصد تھا کہ اردو میں ایران اور عرب دنیا کی طرح نسخ ٹائپ کو رواج دیا جائے۔ سارا مشرقِ وسطیٰ لیتھو کی چھپائی کے چنگل سے آزادی پا چکا تھا۔ عالمِ عرب میں تو نسخ ٹائپ با آسانی رائج ہو گیا کیونکہ اس کی لکھائی عربی حروف کی شکل میں تھی۔ اہلِ ایران نے کمال کیا اور اپنی قدیم نستعلیق چھوڑ کر نسخ کو گلے لگا لیا اور وہاں ساری کتابیں اور رسالے اسی خط میں اور ٹائپ پر طبع ہونے لگے۔ اور ایران کا تو یہ دستور ہے کہ ہر کتاب اور ہر رسالہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ وہاں ٹائپ نے ایسی مقبولیت حاصل کی اور لیتھوگرافی کو ایسا دیس نکالا ملا کہ کاتب نامی مخلوق ختم ہوئی اور خطاطی کا کام مصوروں نے سنبھال لیا جیسا کہ اب ہندوستان اور پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔

پاکستان قائم ہوتے ہی کچھ باذوق حکام کو خیال آیا کہ یہاں بھی نسخ کو رواج دیا جائے



تا کہ ٹائپ میں چھپائی ہو اور پڑھنے لکھنے کا کام خوش اسلوبی سے آگے بڑھے۔

مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے فیصلہ کیا کہ بچوں کی ساری درسی کتابیں نسخ میں کتابت کرائی جائیں۔ اس طرح ایک پوری نسل اس خط کو پڑھنے کی عادی ہو جائے گی جس کے بعد ٹائپ رائج کرنا سہل ہو جائے گا۔

بہت کم لوگوں کو یاد یا معلوم ہوگا کہ قائدِ اعظم کی تحریک پر شروع ہونے والا انگریزی روزنامہ ڈان شروع شروع میں اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔ یہ اردو ڈان نسخ ٹائپ پر چھپتا تھا۔

ادھر انجمن ترقی اردو کی کوشش سے نسخ ٹائپ کو بہتر بنایا گیا اور انجمن کی کتابیں اسی پر شائع ہونے لگیں۔ لاہور میں ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والوں نے کتاب سازی میں اسی ٹائپ کو رواج دیا۔ ان کا جریدہ 'سویرا' ٹائپ پر چھپا۔ باری کی کتاب 'کمپنی کی حکومت' سے لے کر مجاز کی 'آہنگ' تک کتنی ہی کتابیں نسخ ٹائپ سے آراستہ ہوئیں۔ اور سب سے بڑھ کر لاہور ہی میں مجلسِ ترقی ادب نے کلاسیکی ادب کے سیکڑوں شہ پارے نہایت عمدہ ٹائپ میں شائع کیے۔ غرض یہ کہ یہ سلسلہ چلتا تو رہا مگر ہچکیاں لے لے کر۔

سب سے پہلے اردو ڈان بند ہوا۔ سویرا اپنے خواب دیکھنے والوں کے ارمانوں کے برعکس نہ سرخ ہوا اور نہ سرخ رو۔ مجلس ترقی ادب کا کلاسیکی ادب فٹ پاتھوں پر کوڑیوں کے بھاؤ بکا اور بحیرہ عرب کے ساحل سے لے کر تا بخاک پشاور ہمارا کاتب ہی اپنی کتابت کے ڈنکے بجاتا رہا۔ نستعلیق نے اپنی چولی ہمارے دامن سے ایسی باندھی کہ پھر لاکھ جتن کیے گئے، یہ نہ کھلنی تھی، نہ کھلی۔

اس سلسلے میں آخری ناکام کوشش میر خلیل الرحمان نے کی۔ آفسٹ کی طباعت شروع ہو چکی تھی۔ کتاب اب پیلے مسطر کی بجائے قدرے شفاف ٹریسنگ کاغذ پر ہونے لگی اور تصویروں کے بلاک کی بجائے طباعت کے لیے ان کی فلمیں بنائی جانے لگیں۔

اُس وقت میر صاحب نے نسخ ٹائپ کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کہیں سے ٹائپ رائٹر سے ملتی جلتی کمپوزنگ کی ایسی مشین لائے جس میں عبارت کاغذ پر نہیں بلکہ شفاف فلم پر ٹائپ ہو کر نکلتی تھی۔ اس کے بعد کام آسان تھا۔ فلم کو چھاپہ خانے میں بھیجا، اس نے پلیٹ بنائی اور تھوڑی ہی

دیر میں چھاپ دی۔ مگر میر خلیل الرحمان اپنا پورا اخبار اس ٹائپ پر لاتے ہوئے ڈرے ہوں گے، تو انہوں نے اسے صرف قارئین کے مراسلوں تک محدود رکھا۔ جنگ میں روزانہ مراسلوں کے دو کالم اسی جدید ٹائپ میں طبع ہوتے تھے۔

جب اس طرح کئی مہینے گزر گئے تو اخبار نے اپنے پڑھنے والوں کا ایک سروے کرایا۔ ان سے پوچھا گیا کہ اب بتایئے۔ آپ کو یہ جدید ٹائپ منظور ہے یا نہیں۔

جواب کیا آیا، ایک شور اٹھا 'نہیں'۔

لوگوں نے کہا کہ ہم سے یہ خط جو نسخ کہلاتا ہے پڑھا ہی نہیں جاتا۔ آنکھیں اس کی عادی نہیں اور مطالعے میں دشواری ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارا خطِ نستعلیق واپس کیجئے۔

لیجئے صاحب، خطِ نسخ کی فلم بنانے والی مشین دوبارہ اپنے اصل ڈبوں میں بند کر کے کہیں کسی گودام میں ڈال دی گئی جسے یقین ہے نستعلیق کا زنگ چاٹ گیا ہوگا۔

کتابت کا پرچم ایک بار پھر کراچی کی سمندری ہواؤں میں زور زور سے لہرانے لگا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب ووٹروں کی فہرستیں چھپنے کا زمانہ آیا۔ سیکڑوں کاتبوں نے گھر جانا چھوڑ دیا۔ انہیں جہاں جگہ ملی انہوں نے تکیہ جما کر ووٹروں کی فہرستوں کی کتابت شروع کر دی۔ رات رات بھر سارے کاتب چائے پیتے اور بیڑیاں پھونکتے رہتے تھے اور فہرستیں لکھا کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سرکار سے معقول معاوضہ پاتے تھے۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب روسی مصنف الیگزانڈر سولزے نِت سِن کی مشہور کتاب 'گولاگ آرکی پے لاگو' ماسکو سے کسی طرح مغرب میں پہنچی، جو اسٹالین کے بیگار کیمپوں میں ہونے والے مظالم کے بارے میں تھی، امریکیوں کو اس کی کوئی ادا ایسی بھائی کہ انہوں نے راتوں رات اسے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کرانے کی ٹھان لی۔ کرۂ ارض کے اطراف میں امریکی سفارت خانے حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے کراچی میں ہمارے اخبار کے نیوز ایڈیٹر کو یہ کام سونپا کہ اسے جیسے بھی بنے راتوں رات شائع کرا دو۔ نیوز ایڈیٹر صاحب جس طرح اپنے ماتحت عملے کو ترجمے کے لیے خبریں تقسیم کرتے تھے بالکل اسی طرح 'گولاگ' کے صفحے تقسیم کر دیے۔ سورج



بمشکل دو بار طلوع ہو پایا ہوگا کہ روسی ناول کو اردو کا جامہ پہنا دیا گیا اور اِدھر ترجمہ ہو رہا تھا اُدھر کاتب حضرات ہاتھ کے ہاتھ کتابت کرتے جا رہے تھے۔ یہ 'آنا فانا' کی ترکیب ایسے ہی موقعوں کے لیے وضع ہوئی ہوگی۔ دیکھتے دیکھتے پاکستان کے کتب فروشوں نے اپنی دکانوں کے نمایاں حصوں میں یہ روسی ناول سجا دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں یہ کتاب مفت ہی تقسیم ہوئی۔ مگر کتابت کے پیشے نے اس چیلنج کو جیسے قبول کیا، نسخ کا فرسودہ ٹائپ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

امریکی سفارت خانے نے 'سیر بین' کے نام سے اپنا جریدہ نکالا۔ اس میں بھی کتابت ہی سے کام چلایا گیا۔ امریکہ ہی کے مکتبہ فرینکلن نے اور خدا جانے کس کس نے پاکستان کے اسکولوں کی بعض درسی کتابیں چھاپیں۔ سب کاتب ہی کی مرہون منت تھیں۔ صرف چین اور روس سے چھپ کر جو اردو کتابیں اور رسالے آتے تھے اور آٹھ آٹھ آنے اور دس دس آنے میں فروخت ہوتے تھے وہ سارے کے سارے خط نسخ میں اور ٹائپ میں ہوا کرتے تھے۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ دائیں بازو والوں اور بائیں بازو والوں کے درمیان سرد جنگ اسی نسخ اور نستعلیق کے سوال پر چھڑی ہوئی ہے۔

کاتبوں کا ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ خوش خط تو سارے تھے کہ کھاتے ہی اسی کی تھے لیکن پڑھے لکھے برائے نام تھے۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ تم لوگ جو کچھ لکھتے ہو اگر اسے سمجھ بھی لو تو دنیا کے بڑے دانشور ٹھہرو۔

اب تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص افلاطون اور ارسطو کا سارا فلسفہ لکھنے کے بعد گھٹنے سیدھے کرنے کے لیے انگڑائی لے کر اٹھے اور اس سے پوچھا جائے کہ ارسطو اور افلاطون کون تھے تو وہ کہے کہ حکیم تھے، نسخے لکھا کرتے تھے۔

کاتب کو ایک اور کام بھی بخوبی آتا تھا، اور وہ تھا کتابت کے دوران جا بجا غلطیاں کرنا۔ جو شخص شبلی کو ستی لکھ دے اور کچھ کا کچھ لکھ کر منشی گری کے نام کو بٹہ لگائے اسے کیا کہیے۔ حالت یہ تھی کہ اردو اخباروں میں عملے کو ہدایت کی جاتی تھی کہ اپنی تحریر میں پانچ چھ لفظ ایسے ہیں جو کبھی نہ لکھے جائیں بلکہ ان کے متبادل لکھے جائیں کیونکہ خطرہ یہ ہے کہ کاتب ادبدا کر

انہیں غلط لکھے گا۔

قرۃالعین حیدر کی مشہور تحریر کا عنوان ہے: قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے۔ کاتب نے لکھا: قید خانے میں تلاطم ہے کہ نیند آتی ہے۔ اب یہ نہیں کہ اس نے عقل پر زور دیا ہوگا اور کسی استدلال سے کام لے کر عبارت تبدیل کی ہوگی۔ وہ تو لکھنے والی مشین تھا، بس لکھے جاتا تھا۔ اگر عقل پر زور دیتا تو سوچتا کہ 'ہند' مونث کیسے ہوگیا اور پھر لکھتا کہ قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتا ہے۔ خیر۔

ایک بار ایک روزنامے کی شہ سرخی میں ایسی بھیانک غلطی ہوئی کہ بازار سے سارا اخبار واپس منگا کر دوبارہ چھاپنا پڑا۔

منشی گری کے اس نقص کا بس ایک ہی فائدہ تھا اور یہ بھی کاتب کو نہیں بلکہ مصنف کو۔ جہاں کہیں اس سے لکھنے میں کوئی بھول ہوئی، آپ چاہیں تو اسے حماقت بھی کہہ لیجیے، اس نے جھٹ سارا الزام کاتب کے سر ڈالا۔ خود کاتب دبے لفظوں میں شکایت کیا کرتے تھے کہ سارا الزام ہمارے کاندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے حالانکہ آپ اصل مسودہ دیکھیں تو حال یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات خود مصنف بھی چشمہ لگا کر اور روشنی کے رخ پر کر کے اپنا ہی لکھا ہوا پڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا جانے کیا لکھا ہے۔

مجھے وہ بھی یاد ہے کہ جب اسٹالن کی بیٹی، جس کا نام سویتلانہ (سویت لانہ) تھا، ماسکو سے امریکہ جا پہنچی اور دنیا بھر کے اخباروں میں اس کی خبریں چھپنی شروع ہوئیں تو اردو اخباروں میں آتے آتے اس کا نام سوتیلانہ (سوتی لانہ) ہوگیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ساری کاتب برادری اپنی گفتگو میں اسے سوتیلانہ کہتی تھی اور سوتیلانہ ہی لکھتی تھی۔ ایڈیٹروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن کاتب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے ساری برادری نے ایکا کر لیا ہے۔ خوب تھا وہ دور بھی۔ کبھی فرصت سے بیٹھ کر اس کا احوال بھی لکھا جائے گا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ دور ختم ہوا۔ وہ بھیانک خواب ٹوٹا اور رنگ بدل کر ہی سہی، نیا سویرا طلوع ہوا۔



یہ اعزاز بھی اخبار جنگ کے بانی میر خلیل الرحمان کے سر جاتا ہے جنہوں نے مرزا جمیل احمد کا ہاتھ بٹایا۔ مرزا صاحب نے خط نستعلیق میں پوری اردو لغت کمپیوٹر کو ذہن نشین کرا دی اور کمپیوٹر نے اشارہ پا کر اس نستعلیق میں حروف ڈھالنے شروع کر دیے جسے ہم نوری نستعلیق کے نام سے جانتے ہیں۔

اخبار جنگ ایک روز جو بازار میں آیا تو یوں لگا جیسے پوری اخبار کی کتابت تنہا ایک کاتب نے کی ہے اور کاتب بھی ایسا کہ اس نے جو حرف ایک بار جیسا لکھ دیا، وہ حرف سو بار آیا تو سو مرتبہ ویسا ہی لکھا۔

ستواں، متوازن اور متناسب حروف، صاف ستھرے کش، عمدہ دائرے، لاجواب مرکز، لفظوں کی بے مثال نشست، ہر سطر میں زیادہ حروف کھپائے ہوئے، الفاظ قرینے سے جمائے ہوئے۔ ایسی کتابت کسی نے کب اور کاہے کو دیکھی ہوگی۔

کمپیوٹر کی اس کتابت میں، جیسا کہ ہوتا آیا ہے، شروع میں کچھ عیب تھے اور کچھ عیب اب تک ہیں، مگر وہ ایک ایک کر کے نکالے جا رہے ہیں۔ پہلے سنا ہے یہ کمپیوٹر ایک کمرے کے برابر جگہ لیتا تھا، اب ایک میز کے کونے میں سما جاتا ہے۔ پہلے یہ تھا کہ جو لفظ اس کی یادداشت میں نہیں تھے انہیں خط نسخ میں لکھنے پر مجبور تھا۔ اب ہر پیچیدہ سے پیچیدہ اور اجنبی سے اجنبی لفظ بنا دیتا ہے۔ کچھ برس پہلے میری یہ تحریر کاتب لکھ رہا ہوتا، اب میں اپنے کمرے میں بیٹھا خود لکھ رہا ہوں۔

غرض یہ کہ کاتبوں کی فوج رخصت ہوئی۔ ان ہی میں سے کچھ لوگوں نے کمپیوٹر چلانا سیکھ لیا۔ پھر پڑھے لکھے نوجوان اس میدان میں آئے اور جہاں تیس تیس آدمی بیٹھ کر رات رات بھر آنکھیں پھوڑا کرتے تھے وہاں اب چند لوگ بیٹھے ہوئے ایک ذرا سا سر کھپاتے ہیں اور باقی کام برقی کمپیوٹر اور اس کا ڈیجیٹل دماغ کرتا چلا جاتا ہے۔ کام آسان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ بلا کا آ گیا۔

نوری نستعلیق سے ملتے جلتے خوش نویسی کے کچھ اور نظام بھی وضع ہوئے ہیں مگر ان میں وہ بات نہیں۔ یہ بات انہیں بھی مان لینی چاہیے۔

کمپیوٹر کو اردو خطاطی کیسے سکھائی گئی، یہ ایک الگ موضوع ہے اور اس کی داستان جدا ہے۔ یہ نظام چینیوں سے کس طرح مستعار لیا گیا، اس کے حروف کی کتابت کیسے کی گئی، ان کے جوڑ کیونکر بٹھائے گئے، ان حروف سے شہ سرخیاں کیسے لکھی گئیں، الفاظ ایک دوسرے پر کس طرح چڑھائے گئے اور سات کالم کی عبارت پانچ کالموں میں کیونکر سمائی، یہ سب باتیں کہیں اور ہونی چاہیں۔

بس ایک بات اور۔ کاتب کا ایک مرض کمپیوٹر میں وائرس بن کر چلا آیا ہے جس کا ابھی تک کوئی توڑ نہیں نکلا۔

پے در پے غلطیاں کاتب بھی کرتا تھا، پے در پے غلطیاں کمپیوٹر کے کی بورڈ پر بیٹھا ہوا شخص بھی کیے جا رہا ہے۔

اگر اُس سے بھی خدا ہی سمجھا تھا، تو اِس سے بھی خدا ہی سمجھے۔

☆☆☆